پروفیسر ریاض الاسلام

صوفیانہ ادب کے لیے ایک منہاج تحقیق کی ضرورت

ملفوظات اور تذکروں کے لطائف کے حوالے سے

صوفیانہ ادب میں "لطیفہ" کیا چیز ہے؟ دراصل کسی بھی چیز کی اصطلاحی تعریف کرنا ایک مشکل کام ہے۔ لطیفے کی تعریف کرنا بھی آسان نہیں۔ خود صوفیانہ ادب میں یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں یہ اصطلاح جس معیّن اور محدود معنی میں استعمال کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ لطائف وہ باتیں ہیں جو صوفیہ کے ملفوظات میں یا ان کے تذکروں میں یا اصولِ تصوف کی کتابوں میں بطور سوانح، شخصی واردات یا بطور قصّہ بیان کی گئی ہیں۔ جہاں گفتگو یا بیان غیر شخصی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور پیرایۂ بیان خالص علمی ہو جاتا ہے تو پھر بات "لطیفہ" کی حدود سے باہر نکل جاتی ہے۔

لطائفی ادب

یہ مضمون صوفیانہ ادب کے ان لطائف پر مرکوز ہے جو اوپر دی ہوئی تعریف کی حدود میں آتے ہیں۔ ملفوظات اور تذکروں میں خصوصاً اور اصولِ تصوف کی کتب میں عموماً لطائف کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ بعض ملفوظات کا بڑا حصہ لطائف پر ہی مشتمل ہوتا ہے، مثلاً حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات فوائد الفواد اور ان کے خلیفۂ اعظم شیخ نصیر الدین چراغ کے ملفوظ خیر المجالس۔ بعض دیگر ملفوظات کی ترتیب علوم کی شاخوں کی مناسبت سے ہوتی ہے اور ان میں لطائف کا عنصر محدود ہے، مثلاً مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ملفوظات سراج الہدایہ۔ تصوف کی اصولی کتابوں مثلاً کتاب التعرف (کلاباذی)،

کتاب اللمع (ابونصر سراج)، رسالہ قشیریہ اور کشف المحجوب (ہجویری) میں لطائف کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ صوفیانہ مطالعات کے فروغ کے باوجود لطائف کے خصوصی مطالعے پر کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ لطائف کی تاریخ پر غور کیا گیا ہے، نہ ان کے سوابق اور لواحق پر، نہ ان کی ہیئت ترکیبی پر، اور تجزیے کا عمل تو لطائفی ادب کو چھو کر بھی نہیں گیا۔ جب صوفیانہ ادب کا ایک معتدبہ حصّہ لطائف پر مبنی ہے تو لطائف کے ناقدانہ تجزیے اور ایک منضبط منہاجِ تحقیق Methodology کے بغیر کس طرح حق مطالعہ ادا کیا جا سکتا ہے؟

لطائفی ادب کے مسئلے پر کئی زاویوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اس صنف کا آغاز خود ایک دلچسپ موضوع ہے۔ لطائف کی ماہیت پر نظر رکھتے ہوئے یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی عنوان سے اس کا تعلق قصص کی روایت سے ہے۔ اسلامی مذہبی ادب میں انبیا کے قصص کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک امر مسلمہ ہے کہ روایتی قصص الانبیا میں معتدبہ حصّہ اس قبیل سے ہے جسے "اسرائیلیات" گردانا جاتا ہے اور جسے اب لائق اعتماد نہیں سمجھا جاتا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی کتاب قصص القرآن میں بار بار اس امر پر تاسف کیا ہے کہ بعض مفسرین نے "اسرائیلی خرافات" اور "اسرائیلی ہفوات" کو قرآنی قصص کی تفسیر میں شامل کر لیا ہے[۱]۔ بہر حال صوفیانہ لطائف اور روایاتی قصص الانبیا کے روابط کا مسئلہ تحقیق طلب ہے اور یہ مختصر مضمون اس پہلو کا اجمالی احاطہ بھی کرنے سے قاصر ہے۔

لطائفی ادب مختلف الالوان عناصر کا مجموعہ ہے۔ اس میں روحانیت اور حکمت کے ہیرے جواہر بھی ملیں گے اور جلالی لطائف کے تیز دھاری پتھر بھی۔ انفاق، ایثار اور انسانی ہمدردی کے اعلیٰ ترین نمونے بھی اور نفس کشی اور کنبہ گریزی کے قصے بھی۔ لطف یہ ہے کہ صوفیوں کی ہمدردی صرف مسلمانوں اور صرف انسانوں تک محدود نہیں تھی، ان میں جانوروں سے ہمدردی کے ایسے حیرت انگیز قصے ملتے ہیں جن میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ بیمار جانوروں کی دیکھ بھال تمام عبادات اور زہد و ورع سے بلند تر مقام رکھتی ہے۔ جہاں تک لطائف میں رشد و ہدایات کے اسباق کا تعلق ہے تو صوفیانہ تعلیمات کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو لطائف میں کسی نہ کسی شکل میں پیش نہ کیا گیا ہو۔

لطائف میں چند عناصر ایسے بھی ہیں جن کا تواتر بھی زیادہ ہے اور انھیں علمی مقاصد کے لیے

استعمال کرنے میں مزید حزم و احتیاط بھی ضروری ہے۔ ان میں پہلے تو کرامات اور خصوصاً تقابلی کرامات کے لطائف ہیں۔ تقابلی کرامات سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ شیخ یہ کچھ کر سکتا ہے تو یہ شیخ اس سے زیادہ کر سکتا ہے، اگر اس کا چہرہ دیکھ کر جنت جانا یقینی ہو جاتا ہے تو اس کی بستی سے صرف گزرنا ہی اس مقصد کے لیے کافی ہے۔ تقابلی کرامات کے ساتھ تعلی کی چاشنی آنا لازمی تھی۔

دوسرا عنصر شطحیات کا ہے۔ شطحیات وہ اقوال یا باتیں ہیں جو صوفی حضرات سکر اور جذب کی حالت میں کہہ گزرے ہیں۔ شطحیات گوئی میں بلند پایہ شیوخ بھی ہیں اور ان سے کم درجے کے بزرگ بھی شامل ہیں۔ شطحیات میں صوفیوں نے کیا کچھ نہیں کہا۔ ان شطحیات کی توضیح بھی کی گئی اور ان توضیحات نے ایک نئی صنف کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن ایسے اقوال بھی ہیں جن پر توضیح کی چادر چھوٹی پڑ جاتی ہے۔

غرض یہ کہ تقابلی کرامات، تعلی، شطحیات اور لطائف المجاز (یعنی عشق و محبت کے واقعات جو بسا اوقات توضیحی مثال کی طرح استعمال کیے گئے ہیں) نے لطائفی ادب کو مجموعی طور سے ایک ایسی صنف کا مواد بنا دیا ہے جس کو علمی سطح پر استعمال کرنے میں بڑی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔

لطائفی ادب کی مقبولیت

لطائفی ادب میں بڑی دلآویزی ہوتی ہے اور اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کا سبب بیان کرنا مشکل نہیں۔ دلیل چاہے فقہی ہو یا اصول تصوف کی ہو، اس کا سمجھنا عام آدمی کے لیے محال ہے اور پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت کے لیے بھی کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن اسی بات کو لطیفے میں لپیٹ کر بیان کر دیجیے تو اس کو ہر شخص دلچسپی سے سنے گا۔ عام لوگ اس کے سیدھے سادے معنی سمجھ جائیں گے اور خاص لوگ لطیفے کی معنویت پر غور کریں گے۔ صوفیہ کا واسطہ چونکہ ہر طبقے کے لوگوں سے ہوتا تھا اور بعض صوفیانہ سلسلے عوام سے قریبی رابطے رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے لطائف کو اپنی تعلیم اور تبلیغ کے ذریعے کے طور پر اختیار کیا اور ابلاغ کے وسیلے کی حیثیت سے اس کی تاثیر کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ بعض اکابر صوفیہ نے لطیفہ بیان کرنے کا بڑا دل نشین پیرایہ وضع کیا۔ حضرت نظام الدین اولیا کے لطائف جو ان کی ملفوظات فوائد الفواد

میں دیے گئے ہیں ان میں بڑی دل آویزی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی شخصیت کے جمال کے آئینہ دار ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ اس عہد کے صوفیانہ ادب میں لطائفی عنصر کا فروغ ایک طرف مذہبی اور روحانی تقاضوں کی پیداوار تھا تو دوسری طرف لطائف نے تصوف کے ابلاغ کی ضرورت کو بھی باحسن وجوہ پورا کیا۔

لطائف کی پرکھ

اب مسئلہ یہ ہے کہ جب لطائف کا عنصر صوفیانہ ادب میں اتنا اہم ہے تو اسے کس طرح پرکھا جائے۔ کیا تمام لطائف کو جو قابل اعتبار یا قریب الاعتبار ملفوظات میں پائے جاتے ہیں، صحیح مان لیا جائے؟ کیا صحیح ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ان لطائف کے مندرجات کو تاریخ میں گزرے ہوئے واقعہ کی طرح سمجھا جائے؟ یا اس امر کا امکان ہے کہ بعض یا بہت سے لطائف کسی خاص نکتے کو اجاگر کرنے کے لیے وضع کیے گئے؟ مراد یہ ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لطیفے کی روایت صحیح ہے، یعنی جن بزرگ سے منسوب ہے انھوں نے کم و بیش انھی الفاظ میں بیان کیا تھا جو ملفوظ یا تذکرے میں دیے گئے ہیں، تو کیا یہ ضروری ہے کہ لطیفے میں بیان کردہ واقعات کو اصلاً صحیح سمجھا جائے؟ دراصل جس طرح تاریخی واقعات کے پرکھنے میں اعتبار اور بے اعتباری کی کئی سطحیں آتی ہیں، اسی طرح لطیفوں میں درجۂ اعتبار متعین کرنا یا کم از متعین کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

لطائف اور مثالیہ

یہ بات خاص طور سے توجہ اور تنقیح کے لائق ہے کہ کوئی لطیفہ PARABLE یا مثالیہ کے کتنا قریب ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی یہ بتائے گئے ہیں "مفروضہ واقعات کا بیان، کسی اخلاقی یا روحانی بات کو بطور مثال سمجھانے کے لیے۔" اس معنی کے لحاظ سے مثالیہ میں بیان کردہ واقعات مفروضہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ چیمبرز ڈکشنری میں دیے ہوئے معنی کسی قدر مختلف ہیں: "کہانی یا قصہ جس میں بیان کردہ باتوں میں سے ہو سکتا ہے کچھ واقع بھی ہوئی ہوں اور جو کسی عقیدے، نظریے کو بطور مثال سمجھانے کے لیے یا کسی ڈیوٹی یا فریضے کو واضح کرنے کے لیے بیان کیا جائے"۔ اس دوسرے معنی میں یہ گنجائش ہے کہ PARABLE

کا کچھ حصّہ واقعتاً بھی صحیح ہو، لیکن دونوں لغات میں زورِ مقصد پر ہے، بیان کردہ قصے کی صحت پر نہیں۔ لطائف کی چند مثالوں سے زیرِ بحث نکتہ واضح ہو جائے گا۔ رسالہ قشیریہ میں یہ لطیفہ درج ہے کہ "ایک شخص نے ایک لونڈی بطور تحفہ جبلہ ابن سحیم کے پاس بھیجی۔ اس وقت وہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ تو بہت بُری بات ہے کہ تمھاری موجودگی میں اسے اپنے لیے لے لوں، اور میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ کسی خاص ایک شخص کو دوں جب کہ تم میں سے ہر ایک کا حق اور احترام ہے، مگر لونڈی تو تقسیم نہیں ہو سکتی۔ وہ سب اسّی آدمی تھے۔ لہٰذا انھوں نے ہر ایک کو ایک ایک لونڈی بخش دی۔"[۲]

یہ لطیفہ صوفیوں کے جود و سخا کے باب میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر اسے واقعہ مان لیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ صوفی موصوف کے پاس اتنی باندیاں ہونے کا کیا جواز تھا۔ اور اگر الفاظ کے معنی کو کھینچ تان کر کے یہ سمجھا جائے کہ صوفی نے اسّی کنیزیں خرید کر لانے کا حکم دیا تو یہ بات بجائے خود احسن نہیں اور سوال پیدا ہوگا کہ صوفی کے پاس اتنے مال و دولت کا کیا کام؟ لیکن اگر اس لطیفے کو مثالیہ PARABLE گردانا جائے تو پھر اس میں جو مبالغے کا عنصر ہے وہ صحیح پیمانے پر آجاتا ہے، اس لیے کہ مثالیہ میں مبالغے کی گنجائش ہوتی ہے PARABLE میں یہ بھی گنجائش ہوتی ہے کہ کوئی انوکھی بات کہی جائے جو جالبِ توجہ، مثلاً رسالہ قشیریہ ہی میں بیان ہے کہ "ایک شخص نے ایک عورت سے رشتہ کیا۔ قبل اس کے کہ وہ اس کے گھر آئے، اسے چیچک ہو گئی اور ایک آنکھ جاتی رہی۔ مرد نے جب یہ سنا تو اس نے بھی کہا میری آنکھ میں درد ہے، پھر کہا کہ میں نابینا ہو گیا، پھر وہ عورت اس کے گھر آ گئی اور بیس سال اس کے گھر رہی، پھر مر گئی۔ تب اس شخص نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں نے کہا یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا میں نے (دانستہ) اپنے آپ کو اندھا بنا لیا تھا تاکہ اس عورت کو میری طرف سے کوئی نکر نہ ہو۔ لوگوں نے کہا کہ تو جواں مردی میں سب پر سبقت لے گیا۔"[۳]

یہ لطیفہ بھی ایثار کے مثالیہ کے طور سے سمجھا جا سکتا ہے، اسے اصل واقعہ ماننے سے اشکال پیدا ہوگا۔

ایسے لطائف بے شمار ہیں جو بیّن طور سے مثالیہ ہیں۔ مثالیہ کی ایک اچھی مثال حسب ذیل ہے۔

سیر محمدی جو خواجہ گیسو دراز کے "احوال و افعال و اقوال" پر مشتمل ہے اور خواجہ کی وفات کے صرف پانچ سال بعد مرتب ہوئی، اس میں درج ہے کہ وہ جامع مسجد دہلی کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ انھوں نے ایک شخص کو دیکھا جو قے کر رہا تھا اور اس کے منہ سے بگنی (شراب) اور گوشت کے ٹکڑے نکل کر باہر آ رہے تھے اور ایک خارش زدہ کتا اسے کھا رہا تھا اور جو لوگ وہاں سے گزر رہے تھے وہ اس شخص پر لعن طعن کر رہے تھے۔ حضرت مخدوم کو اس شخص کی پیشانی پر نعمت کے آثار نظر آئے، وہ جب وہاں سے چلا تو آپ اس کے پیچھے ہو لیے۔ وہ شخص ایک حوض پر گیا اور اس نے وضو کیا اور دیر تک مضمضہ (غرارہ) کرتا رہا، پھر اس نے دوگانہ ادا کیا۔ حضرت بندگی مخدوم نے اسے بڑی سخت قسم دے کر پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے ناچار ہو کر بتایا کہ میں ابدال ہوں، میرا نام رکن الدین ہے۔ میں یہاں سے ہزار کوس دور ایک جگہ پر تھا، مجھے حکم ملا کہ جامع مسجد دہلی کے دروازے پر ایک خارش زدہ کتا ہے جو کمزوری کے باعث چل پھر نہیں سکتا۔ تم وہاں جاؤ بگنی اور گوشت خریدو اور کھاؤ اور پھر اس کتے کو کھلاؤ۔[۵۴]

خواجہ گیسو دراز کا ہی بیان کیا ہوا ایک اور لطیفہ جوامع الکلم (مخطوطہ برٹش میوزیم) میں دیا ہوا ہے جس کی تفصیلات بڑی دلچسپ ہیں۔ اس کا اجمال یہ ہے کہ خدا نے ایک زاہد کو خبردار کیا کہ وہ شہر پر آگ کا عذاب نازل کرنے والا ہے اور تمام شہر میں صرف ایک گھر محفوظ رہے گا اور وہ ایک فاحشہ عورت کا ہے۔ زاہد نے اس فاحشہ کے گھر جا کر پناہ لی۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ اس شہر میں ایک خارش زدہ کتا تھا، جسے ہر شخص دھتکار کر بھگا دیتا تھا، صرف اس عورت نے اس کی خبر گیری کی تھی۔ تمام اہل شہر جل کر خاک ہو گئے اور زاہد بھی اپنے زہد کے باوجود صرف اس طرح بچ سکا کہ رات فاحشہ کے سایۂ حفاظت میں گزاری۔[۵۵]

یہ دونوں لطیفے واضح طور پر مثالیہ ہیں اور ان کا پیغام یہ ہے کہ خدا کی کمین ترین مخلوق بھی ہمدردی اور رحم کی مستحق ہے۔ دوسرے لطیفے میں تاکید مزید اس پر ہے کہ اس ہمدردی کے بغیر عمر بھر کا زہد بے سود ہو سکتا ہے اور یہ ہمدردی ہو تو عمر بھر کا عصیاں بھی قابلِ معافی ہے۔ پہلے لطیفے میں یہ پیام بھی لپٹا ہوا ہے کہ بندے کو اپنے رزق کے لیے خدا پر بھروسا کرنا چاہیے جو مریل کتے کے لیے بھی ہزاروں میل دور سے کسی کو بھیج کر انتظام کر سکتا ہے۔

اس نوع کے لطیفے تصوف کی اصولی کتب اور تذکرہ و ملفوظ میں پائے جاتے ہیں اور ان کا مقصد ظاہر ہے۔ یہاں یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ مذہبی کتب میں مثالیہ PARABLE کی ہمیشہ بڑی اہمیت رہی ہے، اور اکثر الہامی کتب مثلاً عہد نامہ ہائے عتیق و جدید میں اسے اخلاق سبق اور مذہبی ہدایات کے ابلاغ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اس سیاق و سباق میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ صوفیانہ ادب میں بہت سے لطائف کو بطور واقعہ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ابدال رکن الدین سے ملاقات اور گفتگو کی جزئیات اس کی شاہد ہیں کہ انھیں بطور امر واقعہ پیش کیا گیا۔

ایک اور پرکھ

کسی لطیفے کی اہمیت اور اعتبار کو جانچنے کے لیے ایک اور پرکھ یہ ہے کہ آیا اس نوع کے لطیفے پہلے بھی آچکے ہیں؟ تلاش کیا جائے تو ایسے لطائف خاصی تعداد میں ملیں گے جن سے ملتے جلتے لطیفے پیش رفتہ ماخذ میں موجود ہیں۔ اس کی سب سے دلچسپ اور نمایاں مثال حسب ذیل ہے۔

رسالہ قشیریہ میں ہے کہ شقیق بلخی نے جعفر بن محمد الصادق سے فتوّت کے بارے میں معلوم کیا۔ انھوں نے شقیق سے کہا پہلے تم بتاؤ۔ شقیق نے کہا اگر (دینے والا) دیتا ہے تو ہم شکر کرتے ہیں، نہیں دیتا تو صبر کرتے ہیں۔ جعفر نے کہا کہ ہمارے یہاں مدینے کے کتے بھی یہی کرتے ہیں۔ شقیق نے دریافت کیا کہ اے ابن رسول پھر فتوّت کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا "اگر دیتے ہیں تو ایثار کر دیتے ہیں، نہیں دیتے تو صبر کرتے ہیں۔"[۶]

پھر شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی نے طبقات صوفیہ میں بیان کیا ہے کہ شقیق بن ابراہیم بلخی نے ایک وقت ابراہیم بن ادہم سے کہا کہ آپ معاش کس طرح کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا جب مل جاتا ہے تو خدا کا شکر کرتے ہیں اور نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں، شقیق نے کہا کہ خراسان کے کتے بھی ایسا ہی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔[۷]

ابو حامد غزالی کی احیاء العلوم جلد چہارم میں بھی ابراہیم بن ادہم اور شقیق بلخی کی گفتگو قدرے مختلف پیرائے میں دی گئی ہے، لیکن زیادہ اہم فرق یہ کہ "بلخ کے کتے" والا فقرہ یہاں ابراہیم بن

ادہم کہتے ہیں [8] پھر عوارف المعارف میں ہے کہ اس قسم کا جواب ایک نوجوان صوفی نے بایزید بسطامی کو دے کر اُنھیں لاجواب کر دیا تھا۔ [9]

یہ ایک ہی لطیفے کی چار شکلیں ہیں۔ بنیادی بات ایک ہی ہے لیکن افراد بدلتے جاتے ہیں۔ احیاء العلوم اور طبقات الصوفیہ میں افراد ایک ہی ہیں، لیکن ان کے رول برعکس ہیں۔ گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے کہ مل جائے تو شکر کرنا ورنہ صبر کرنا تو معمولی درجے کی بات ہے، صوفی کو اس سے کچھ زیادہ کرنا چاہیے۔ صوفیوں کے اوصاف میں یہ لطیفہ ایثار کے ماتحت جگہ پائے گا۔

ایک ہی قصے کی چار مختلف شکلیں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک اصل ہو گا اور بقیہ تین اس کی بدلی ہوئی شکلیں ہوں گی۔ یعنی اصل واقعہ کو صحیح مان لیا جائے تو باقی تین روایتیں وضعی ہیں۔ یہ امکان بھی خارج از بحث نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نوع کا اصل لطیفہ ان چار لطائف سے پہلے موجود ہو، اور کوئی متجسس اسکالر جلد یا دیر میں اس کا کھوج لگا لے۔ پھر یہ چاروں لطائف وضعی ہو جائیں گے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اس نوع کے اوّلین لطیفے میں صرف اتنی بات کہی گئی ہو کہ قوت لایموت ملنے پر شکر اور نہ ملنے پر صبر عام درجے کی بات ہے، یعنی ناکافی ہے لیکن لطیفہ نگار نے بات میں تیکھاپن پیدا کرنے کے لیے کتوں کی مثال کا اضافہ کر دیا ہو۔ اگر یہ آخری گمان صحیح ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ لطیفہ نگار نے ایک روایت کو ایک مثالیہ PARABLE میں تبدیل کر دیا۔

مماثل لطائف کی ایک اور بہت اچھی مثال "شیر و گلاب" والے لطیفے ہیں۔ اس عنوان کا پہلا لطیفہ جہاں تک میرے علم میں ہے سب سے پہلے شیخ عبدالحق دہلوی کی کتاب اخبارالاخیار میں ملتا ہے جس کا رائج متن ۹۲-۱۵۹۱ء (۱۰۰۰ھ) کے چند سالوں کے اندر مرتب ہوا [10]۔ بیان ہے کہ شیخ بہاءالدین ذکریا سہروردی ملتانیؒ جب ملتان میں مستقل قیام کے لیے آئے تو شیوخ ملتان کو ان سے حسد پیدا ہوا اور انھوں نے بطور کنایت دودھ سے بھرا پیالہ شیخ کی خدمت میں بھیجا، مراد یہ تھی کہ شہر میں کسی اور کی گنجائش نہیں۔ شیخ یہ بات سمجھ گئے اور انھوں نے دودھ کے پیالے پر ایک پھول رکھ کر واپس کر دیا۔ مراد یہ تھی اس شہر میں اس طرح رہوں گا

جیسے دودھ کے پیالے پر پھول تیر تا ہے۔ مشائخ ملتان اس ادا کی لطافت سے حیران رہ گئے اور شیخ کے مطیع ہو گئے۔[۱۱]

اخبار الاخیار بڑی تلاش و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے اور اس کا عام انداز سنجیدہ ہے اور یہ لطیفہ لطافت سے خالی بھی نہیں۔ طبع سلیم اسے تسلیم کر سکتی ہے۔ اس کے ماننے میں اگر تامل ہوتا ہے تو اس لیے کہ یہ بات شیخ کے وصال (قریب ۱۲۶۷ء) کے قریب سوا تین سو سال بعد ضبط تحریر میں آتی ہے، اور اس کا استناد بھی نامعلوم ہے۔ مزید براں فضل اللہ جمالی جو اصلاً سہروردی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور خود شیخ کے آثار کی تلاش میں ملتان گئے تھے، انھوں نے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔

اب اس لطیفے کی دوسری شکل دیکھیے۔ الہ دیا چشتی نے خواجہ شمس الدین ترکؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ اپنے مرشد کے حکم کے مطابق پانی پت پہنچے تو انھوں نے وہاں کے بزرگ شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کو اپنے ملازم کے ہاتھ دودھ سے بھرا پیالہ سلام کے ساتھ بھجوایا۔ قلندر صاحب یہ دیکھ کر مسکرائے اور انھوں نے گلاب کا پھول جو سامنے رکھا تھا دودھ پر ڈال دیا اور پیالہ سلام کے ساتھ واپس بھجوا دیا۔ جب یہ پیالہ واپس پہنچا تو خواجہ صاحب بھی اسے دیکھ کر مسکرائے۔ حاضرین نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ میری جانب سے پیالۂ شیر بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ ملک (یعنی علاقہ) مجھے میرے مرشد نے عطا کیا ہے اور یہ میری ولایت سے معمور (یعنی پُر) ہو گیا ہے، اور برادرم قلندر نے جو پھول ڈال کر پیالہ واپس کیا تو اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ انھیں میری ولایت سے کوئی تعلق نہیں اور وہ گل کی مانند اس شہر میں رہیں گے۔ پھر لوگوں نے قلندر صاحب سے پوچھا تو انھوں نے بھی یہی معنی بتائے۔[۱۲]

سیر الاقطاب کا یہ لطیفہ مبینہ وقوع کے قریب تین سو سال بعد تحریر میں آیا۔ الہ دیا چشتی نے اس کا ماخذ تو نہیں بتایا لیکن وہ پانی پت کے خاندانِ شیوخ سے اپنا رشتہ بتاتا ہے اور گمان ہوتا ہے کہ اگر یہ لطیفہ اس کی اپنی ایجاد نہیں تھا تو اس نے اس کی روایت اپنے خاندان والوں سے سنی ہوگی۔ یہ بات تو بہر حال ظاہر ہے کہ یہ ملتان سے متعلق لطیفے کا ہی چربہ ہے۔ اس دوسری شکل میں شیر اور گلاب کی ترسیل میں ترتیب بدل کر لطیفے کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش

کی گئی ہے۔ لطیفے کی یہ دوسری روایت ناقدانہ نظر رکھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے اپنی کتاب بزم صوفیہ میں ملتان والے لطیفے کا ذکر تو نہیں کیا لیکن پانی پت والے کا کیا ہے [۱۳]

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شیر و گلاب کے پہلے لطیفے کے صحیح ہونے کا امکان ہے، اگرچہ اس کا استناد ضعیف ہے اور دوسرا لطیفہ ساقط الاعتبار معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور نوع کے لطیفے جو ملفوظات اور تذکروں میں بڑے تواتر سے نظر آتے ہیں ان کی جانب ایک اجمالی اشارہ کافی ہے۔ رسالہ قشیریہ میں بیان ہے کہ ابراہیم ادہم کو ایک وقت کشتی میں بیٹھنا تھا جس کا کرایہ ایک دینار تھا، اور اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی اور خدا سے کہا کہ مجھ سے رقم مانگ رہے ہیں جو میرے پاس نہیں۔ آنِ واحد میں تمام ریت دینار کے ڈھیر میں بدل گئی [۱۴]

رسالہ قشیریہ سے پہلے ایک ایسا ہی لطیفہ کتاب اللمع میں ابوالحسن بصری کے حوالے سے ایک سیاہ فام فقیر کے بارے میں آتا ہے [۱۵]

اس قسم کے "دریائے زر" والے لطائف شیخ نظام الدین اولیا [۱۶] اور بہت سے دیگر شیوخ کے بارے میں بیان کیے گئے ہیں۔ دراصل ان لطائف کا ایک بڑا واضح مقصد تھا اور وہ یہ کہ عوام، امرا، حکام، غرض سب کو متنبہ کیا جائے کہ شیخ ان کی رقوم کے محتاج نہیں، ان کے لیے زمین اور آسمان کے خزانے کھلے ہوئے ہیں۔ (یہ الفاظ ایک لطیفے کی عبارت سے لیے گئے ہیں) اور کوئی شخص اگر کوئی چیز پیش کش کے لیے لاتا ہے تو اس سے شیخ کی امداد نہیں ہوتی بلکہ دینے والے کی اپنی بھلائی ہوتی ہے۔ ان لطائف کا تواتر ہی ان کا اعتبار کھوٹے کے لیے کافی ہے۔

لطائف کی زمرہ بندی

صوفیانہ لطائف کی اہمیت اور معنویت کو پوری طرح سمجھنے اور اعتبار کو پرکھنے کے کام میں ایک طریقہ جو بے حد مفید اور موثر ثابت ہو سکتا ہے وہ لطائف کی زمرہ بندی (اور بعض صورتوں میں ذیلی زمرہ بندی) کا ہے۔ اس طریق کار کو اب تک نظر انداز کیا گیا ہے۔

سائمن ڈگبی نے اپنے مضمون Qalandars and Related Groups میں قلندروں کے بارے میں لطائف کے چھ زمرے قائم کیے ہیں[۱۷]

یہ زمرہ بندی ایک رہنما کوشش کی حیثیت سے اہم ہے لیکن لطائف کی صرف ایک نوع سے مربوط ہے۔ بطور مجموعی صوفیانہ لطائف کے لیے زیادہ وسیع بنیادوں پر زمرہ بندی درکار ہوگی۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایک سکالر کی وضع کردہ زمرہ بندی دوسرے سکالر کی زمرہ بندی سے مختلف ہوسکتی ہے۔ ہر سکالر اس کام کو اپنے نقطۂ نظر، موضوع تحقیق اور مقاصد کار کے لحاظ سے ترتیب دے گا۔ البتہ اس کا امکان ضرور ہے کہ لطائف کی زمرہ بندی کے کام میں کما حقہ پیش رفت کے بعد وہ مرحلہ آجائے جب ایک بنیادی زمرہ بندی قائم ہوجائے جس میں ہر سکالر اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے ضروری ردّوبدل کرسکے۔

تصوف پر تحقیق کرنے والے علما نے بالعموم ہر لطیفے کو ایک وحدانیہ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہر لطیفے کو تاریخی شہادت کی طرح مان لیا جائے تو تصوف کی عجیب و غریب تاریخ مرتب ہوگی۔ زمرہ بندی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر لطیفے کو ایک جداگانہ اکائی کی طرح رکھا اور پرکھا جائے، اسے انہی نوع کے لطائف کے ساتھ رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے اعتبار کا درجہ متعین کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح دو باتیں تو فوراً سامنے آسکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ لطیفہ نگار کے پیش روؤں نے اس لطیفے کو کس طرح اور کس مقصد کے لیے پیش کیا اور لطیفے میں کون سا پیام لپٹا ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ زیر مطالعہ لطیفہ نگار نے لطیفہ کہاں سے لیا ہے، اس میں کتنا تصرف کیا ہے، اور کس مقصد کے لیے مختلف طور سے استعمال کیا ہے اور اس کا پایۂ اعتبار کیا ہے۔

یہ بات بھی زیادہ وضاحت طلب نہیں کہ مختلف بنیادوں پر مختلف زمرہ بندیاں مرتب ہوسکتی ہیں، مثلاً ایک عام زمرہ بندی اس بنیاد پر ہوسکتی ہے کہ لطائف میں تاریخیت کتنی ہے، یعنی کون سے لطائف ناقص یا بڑی حد تک تاریخی ہیں، کون سے ایسے ہیں جن میں تاریخی اور غیر تاریخی عناصر خلط ہیں، اور کون سے ایسے ہیں جو محض مثالیہ PARABLE ہیں۔ ایک زمرہ بندی موضوعاتی ہوسکتی ہے یعنی موضوعات کی اپنی اہمیت کے لحاظ سے

زمروں کی فہرست قائم کرکے ان کے ماتحت لطائف کی صف بندی کی جائے مثلاً فقر کے لطائف، ورع کے لطائف، حج کے بارے میں لطائف، فتوح کے لطائف وغیرہ وغیرہ۔ ایک محدود لیکن دلچسپ زمرہ بندی ایسی ہو سکتی ہے جو علامتی نشانات کے ماتحت ہو، جیسے "شیر و گلاب" کے لطائف، "دریائے زر" کے لطائف یا "لطائف المجاز" جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

راقم الحروف کی توجہ فی الوقت صوفیانہ سلسلوں کی تعلیمات اور معاشرے اور معاش پر ان کے اثرات پر مرکوز ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میں نے جو زمرہ بندی کی ہے، اس کے کچھ عنوانات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ انفاق، ایثار اور خیرات (داد و دہش) اور فیاضیانہ مہمان داری کے وصف میں لطائف۔

۲۔ فتوحات کے رد و قبول کے بارے میں۔

۳۔ فتوحات کی تقسیم اور استعمال کے بارے میں۔

۴۔ شیخ کے یا دیگر شیوخ کے جلالی انداز کے لطائف۔

۵۔ شیخ کے یا دیگر شیوخ کے جمالی انداز کے لطائف، یعنی تلطف، مہربانی، عفو، رحم کے قصے۔

۶۔ خوابوں کی تعبیر کے قصے۔

۷۔ ایسے لطائف جن میں گنہ گاروں پر رحمت خداوندی کے نزول کا اور زہاد کی رحمت و نعمت سے محرومی کا ذکر ہے۔

۸۔ کرامات کے لطائف، خصوصاً "دریائے زر" والے قصے۔ کرامات کی کئی ذیلی زمرہ بندیاں ممکن ہیں۔

۹۔ فقر کے لطائف اور ان میں خصوصاً فاقے کے لطائف۔

۱۰۔ اہل و عیال کی ذمہ داری پوری کرنے کے لطائف (ان کی تعداد زیادہ نہیں)

۱۱۔ اہل و عیال سے بے اعتنائی کے قصے (ان کی تعداد بہت زیادہ ہے)

۱۲۔ توکل، فقر، زہد، تجرد، ازدواج اور کسب کے بارے میں لطائف۔

۱۳ ۔ لطائف المجاز : حسن و عشق کے لطائف ، بیشتر عشق حقیقی کے مسائل سمجھانے کے لیے ۔
۱۴ ۔ مرشد اور مرید کے روابط اور طریقہ تربیت کے لطیفے ۔
۱۵ ۔ قلندروں سے ، مردانِ غیب سے ، علما سے ، مجذوبوں سے ، غلاموں سے ، اور جوگیوں سے روابط کے قصّے ۔
۱۶ ۔ تعلّی آمیز لطائف ۔ یوں تو انکسار اور نفس کشی تصوف کے اولین اوصاف میں ہیں پھر بھی صوفیانہ لطائف تعلّی سے یکسر خالی نہیں ۔
۱۷ ۔ دوسرے شیوخ سے یا جوگیوں وغیرہ سے مسابقت کے قصّے ۔
۱۸ ۔ یکبارگی موت واقع ہونے کے قصّے ۔
۱۹ ۔ لطائف جن سے معاشی یا سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے ۔
۲۰ ۔ لطائف جن میں تاریخی مواد ہے یا نظامِ حکومت پر روشنی پڑتی ہے ۔
۲۱ ۔ کتابوں اور کتابی علم کے خلاف اور عقل و فلسفے کے خلاف لطائف ۔
۲۲ ۔ علم کے حق میں لطائف (ان کی تعداد نمبر ۲۱ کے لطیفوں سے کم ہے) ۔

ان زمروں کے ذیلی زمرے بھی قائم کیے جاسکتے ہیں مثلاً گنہ گاروں پر نزولِ رحمت کے مختلف اسباب قائم کیے جاسکتے ہیں ، جن میں ایک سبب کسی انسان یا جانور سے رحم کا برتاؤ ہو سکتا ہے ۔ کرامات کے ذیل میں بہت سے عنوان قائم کیے جاسکتے ہیں مثلاً دستِ غیب ، دریائے زر ، علم غیب یا پیشگی علم ، مسیحائی ، ہدم وغیرہ وغیرہ ۔ غلاموں کے تعلق سے کئی ذیلی زمرے قائم کیے جاسکتے ہیں ۔ مثلاً غلاموں کے ساتھ برتاؤ ، غلاموں کو آزاد کرنا ، غلاموں کی کمائی پر جینا ، بھاگے ہوئے غلاموں کی بازیابی ۔ یہ ذیلی مدیں صرف مثال کے لیے دی گئی ہیں کہ کس طرح ایک ہی مد سے کئی مدیں نکل سکتی ہیں ۔

جلالی لطیفے

جلالی نوعیت کے لطیفوں کی شیوخ کے ملفوظات اور تذکروں میں کوئی کمی نہیں ۔ کسی بزرگ کے حالات میں ان کا عنصر زیادہ ہے اور کسی میں کم ۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ بزرگ جو محبت و شفقت اور رافت کا نمونہ تھے ان کے یہاں بھی جلالی لطیفے ناپید نہیں ۔ ایک دو

مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ خیرالمجالس میں شیخ نظام الدین اولیا کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ شیخ فرید کی خدمت میں ایک درویش حاضر ہوا۔ شیخ نے اسے کوئی چیز دلوادی اور اس سے واپس جانے کے لیے کہا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ شیخ وہ کنگھا مجھے دے دے۔ شیخ خاموش رہے۔ درویش نے پھر وہی بات کہی۔ شیخ اب بھی خاموش رہے۔ تیسری بار درویش نے اونچی آواز کرکے کہا کہ شیخ کنگھا دے دے، تو تجھے برکت ہوگی۔ شیخ نے کہا کہ وہ برکت میں نے تیرے لیے پانی میں روانہ کردی۔ وہ درویش وہاں سے جانے کے بعد بستی کے نزدیک ایک جگہ پانی میں غسل کرنے کے لیے اترا۔ پانی پایاب تھا، لیکن اس شخص کا پھر کچھ پتہ نہ چلا۔[۱۸]

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ حال کے ایک مورخ نے شیخ فرید پر اپنی تصنیف میں اس لطیفے کو اس نکتے پر ختم کردیا ہے، جب شیخ نے کہا "آں برکت ترا در آب رواں کردیم" اور درویش کے انجام کا ذکر صرف نظر کردیا جس سے لطیفے کی جلالی شان واضح ہوتی ہے۔[۱۹]

خیرالمجالس میں ہی بابا فرید کا ایک اور جلالی لطیفہ درج ہے جس میں شیخ کے لڑکوں کی شکایت پر اجودھن کے متصرف کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔[۲۰] خیرالمجالس کے مولف نے فردوسی سلسلے کے شیخ عماد کے دو نوجوان لڑکوں کے جمنا میں ڈوب جانے کو شیخ نظام الدین اولیا کی کرامات سے منسوب کیا ہے۔ ان نوجوانوں نے قبلاً شیخ کے بارے میں بے ادبانہ الفاظ ادا کیے تھے۔[۲۱]

جلالی لطائف کی بھی ذیلی زمرہ بندی کی جاسکتی ہے جس سے ایک نوعیت کے جلالی لطیفوں کی صف بندی سے ان کے تناظر ما قبل پر روشنی پڑ سکتی ہے اور اس طرف بھی رہنمائی ہو سکتی ہے کہ کون سا لطیفہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ شیخ کے جلال کے نتیجے میں معتوبین کے پیٹ میں درد، سر درد، بینائی کے زوال، اور اسی قبیل کی زحمت کے لطائف چشتی اور سہروردی بزرگوں کے حالات میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ بالکل ایک جیسے لطائف مختلف بزرگوں کے حالات میں ملیں تو یہ واضح اشارہ ہے کہ لطائف نگار کی کوشش تھی کہ اس کے ممدوح پیر کا پلڑا اس کمال میں پیچھے نہ رہ جائے۔ اس بات سے تو شاید زیر تحریر مضمون کے ناقد بھی متفق ہوں گے کہ جلالی لطیفوں کا درجۂ اعتبار کچھ کم ہوجائے تو تاریخ تصوف کے

حق میں بہتر ہی ہوگا۔ لیکن خیر المجالس میں بیان کردہ جلالی لطائف کی صحت کو تو غالباً تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

لطائف حسن و عشق

صوفیانہ ادب میں عشق مجاز کے قصوں کی چاشنی وافر مقدار میں موجود ہے، بلکہ بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ اس قبیل کے قصوں کا تناسب توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ کچھ قصے تو اس قسم کے ہیں جو عشق و محبت الٰہی کے نکات کو عشق مجازی کی مثال دے کر نوآموز سالکین کو سمجھانے کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ پھر بعض قصے حضراتِ صوفیہ کے وارداتِ مجاز کے بارے میں اور بعض غیر صوفیہ لوگوں کے بارے میں ہیں۔

صوفیانہ ادب میں لطائف الحمال کو جمع کیا جائے تو خاصی تعداد ہو جائے گی۔ یہاں نہ ان کا حال پھیلا کر بیان کرنا مقصود ہے اور نہ بات کو طول دینا۔ البتہ غور کرنے والے سکالر کے ذہن میں ایک دو باتیں ضرور کھٹکیں گی۔ ایک تو یہی کہ صوفیانہ لطائف میں مجازی عشق کے قصوں کا اتنا مواد کیوں ہے۔ کیا ان کے بغیر بات کو سمجھنا بالکل ناممکن تھا؟ اس آخری سوال کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ محبت چونکہ بشری زندگی میں ایک آفاقی جذبہ ہے، ہر شخص اس سے واقف ہے اور تھوڑا بہت تجربہ رکھتا ہے، اس لیے عشق الٰہی کے معاملات و مقامات کو سمجھانے کا کام مجاز کے حوالے سے کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس تمام مسئلے پر علم نفسیات کا ماہر نظر ڈالے تو عین ممکن ہے کہ اسے کوئی ایسا پہلو نظر آئے جو تاریخ کے طالب علموں کی نظر سے پوشیدہ ہے۔

آخر میں قارئین کی دلچسپی اور تفہیم کے لیے اس قبیل کے دو لطیفے بیان کیے جاتے ہیں۔ اولیا کی موت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ نظام الدین اولیا نے فرمایا کہ "موت کے وقت اولیا کی حالت وہی ہوتی ہے کہ جیسے کوئی شخص بستر میں سو رہا ہو اور اس کا معشوق اس کے بستر میں آ جائے اور اس آدمی کی آنکھ کھل جائے اور وہ معشوق کو اپنے بستر میں دیکھے جس کی اسے ایک عمر سے طلب تھی تو تم جانتے ہو کہ اسے کیا خوشی اور فرحت حاصل ہوگی"[۲۲]

اس لطیفے میں خوبی یہ ہے کہ اس کے سنانے کی توجیہہ اور مقصد آخری جملے میں موجود

ہے۔ موت کے بعد واصل بہ حق ہونے کی لذت بے حساب کی توقع کو ایک ایسی مثال سے سمجھایا گیا جسے لوگ سمجھ سکتے ہیں ("دانی او راچہ شادی و فرحت آید")۔

دوسرا لطیفہ رسالہ قشیریہ سے لیا گیا ہے۔ "یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں جو شخص نااہل لوگوں میں اپنی محبت کا ذکر کرے وہ اپنی محبت میں جھوٹا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرد نے کسی سے اپنی دوستی کا دعویٰ کیا۔ اس جوان نے اس مرد سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میرا بھائی مجھ سے بہتر اور زیادہ حسین ہے۔ اس شخص نے سر موڑ کر (اس کے بھائی کی طرف) دیکھا، اس لیے کہ اس وقت وہ دونوں (بھائی) چھت پر تھے۔ اس جوان نے اس مرد کو چھت سے (نیچے) پھینک دیا اور کہا کہ جو کوئی بھی مجھ سے دوستی کا دعویٰ کرے اور دوسرے پر نظر ڈالے اس کی سزا یہی ہے"[۲۳]

فوری موت کے قصے

فوری موت کوئی اَن ہونی بات نہیں۔ آج کل بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ کسی غیر معمولی صدمے (اور بعض اوقات غیر معمولی اور غیر متوقع خوشی) کے باعث موت واقع ہو جاتی ہے۔ صوفیوں پر جو شدید روحانی اضطراب کی کیفیت طاری ہوتی رہتی تھی وہ جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے وصال کا واقعہ معروف ہے۔ قوالی کے دوران قوال سے یہ شعر سن کر ان کی حالت غیر ہو گئی۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

تین روز کے مسلسل اضطراب کے بعد ان کا وصال ہو گیا۔ اس شعر کے معانی میں فنا اور بقا کے مضمون کو جس خوب صورتی سے سمو دیا گیا ہے، اسے الفاظ کے حُسن اور شعر کی غنائی تاثیر نے دوبالا کر دیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹی بحر کا یہ شعر ان کے لیے نشتر کا کام کر گیا۔ اس واقعہ کو قبول کرنے میں اس لیے بھی تکلف نہیں ہوتا کہ شیخ نظام الدین اولیا کے ملفوظات فوائد الفواد میں اس کا ذکر ہے[۲۴] اور مزید یہ کہ شیخ کاکی کا انتقال فوری طور سے واقع نہیں ہوا، بلکہ تین روز کی اضطرابی کیفیت کے بعد ہوا۔ لیکن جب ہم گلزارِ ابرار میں پڑھتے ہیں کہ

نہر والہ کے سید احمد حامد نے جوش و خروش کی کیفیت میں قوالوں سے وہی غزل گانے کی فرمائش کی اور جب قوال اس شعر پر پہنچے (کشتگان خنجر الخ) تو اضطرابی کیفیت بڑھ گئی اور اذان سُن کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور سجدے میں جا کر ابدی وصال حاصل کر لیا۔[۲۵] تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حضرت کاکی کے واقعہ کا چربہ تو نہیں ؟

فوری موت کا ایک عجیب و غریب واقعہ جس کا جہاں گیر بادشاہ خود عینی گواہ تھا ملا علی مہرکن کا ہے۔ اس کا حال جہاں گیر نے خود اپنی تزک میں لکھا ہے[۲۶] اور اس کے بیان پر شبہ کرنے کا کوئی سبب نہیں۔ مختصراً واقعہ اس طرح ہے کہ شاہی محفل میں قوال قوالی گا رہے تھے جس میں ٹیپ کا بند یہ مشہور شعر تھا جس کا پہلا مصرع شیخ نظام الدین اولیا سے منسوب ہے اور دوسرا امیر خسرو سے:

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

جہاں گیر نے دوسرے مصرعے کے معنی پوچھے۔ ملا علی نے اس شعر سے منسوب واقعہ بیان کیا اور جب دوسرا مصرع پڑھا تو پڑھتے ہی گر گئے اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ حضرت کاکی اور ملا علی کے واقعات کی صداقت پر شبہ کرنے کا کوئی سبب نہیں، لیکن صوفیہ کے لطائف میں فوری موت کے واقعات کی جو کثرت ہے اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ بات لطیفے کی تاثیر بڑھانے کے لیے تو استعمال نہیں کی گئی۔ اس قبیل کے سب واقعات اگر ناقابلِ یقین نہیں تو سب لائق یقین بھی نہیں۔

لطائف کا استناد اور اعتبار

کتاب اللمع، طبقات الصوفیہ (ابو عبدالرحمن سلمی) اور رسالہ قشیریہ میں بہت سے لطائف کی سند بلکہ سلسلۂ اسناد بھی دیا گیا ہے جس سے اس حد تک اطمینان ہو جاتا ہے کہ جو بات لکھی گئی وہ کسی نہ کسی معروف ذریعے سے مؤلف تک پہنچی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بیان کیا ہوا واقعہ بالذات صحیح ہے، لیکن صحت و عدم صحت کے بارے میں کم از کم مؤلف کی ذمہ داری کم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ

ابو عبدالرحمن سلمی کے رسالے " ملامتیان وصوفیان و جواں مرداں " کے فاضل مصحح ڈاکٹر ابو العلا عفیفی نے یہ رائے بڑی مضبوطی سے ظاہر کی ہے کہ حدیث کے معاملے میں سلمی شائستۂ اعتبار نہیں اور اُنھوں نے صوفیہ کے مقاصد کی تائید میں حدیثیں وضع کی ہیں [۲۷]۔ لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حدیث کے معاملے میں اس پایہ کے مصنفین نے یہ رویّہ اختیار کیا ہے تو پھر خود صوفیہ کی روایات میں کس حد تک احتیاط برتی ہوگی۔ اس امر کے پیشِ نظر سائمن ڈگبی نے خانقاہوں کے حوالے سے جو اختراعی فضا (inventive atmosphere) کا ذکر کیا ہے وہ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

جنوبی ایشیا میں شیخ نظام الدین اولیا کی ملفوظ فوائد الفواد مرتبہ حسن دہلوی اور کسی درجے کم پر شیخ نصیر الدین محمود چراغِ دہلی کی ملفوظ مرتبہ حمید قلندر کو تمام ملفوظات میں سب سے مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں ملفوظات کی تحریر میں بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور سلطان المشائخ اور چراغِ دہلی نے اپنے اپنے ملفوظات پر نظرِ ثانی کی اور چراغِ دہلی نے وہ حصّے قلم زد کر دیے جن میں ان کی غلو آمیز مدح تھی یا ان کی کرامات کا ذکر تھا۔ ان تمام احتیاط کے باوجود ان دونوں میں فوق العادت واقعات کا معتد بہ مواد ملتا ہے۔ امیر خورد کرمانی کی سیر الاولیا میں یہ مواد کچھ اور بھی زیادہ ہے۔ فوائد الفواد اور خیر المجالس میں جو واقعات سلطان المشائخ اور چراغِ دہلی کے اپنے اپنے مشاہدے کے حوالے سے لکھے گئے ہیں ان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن ایسے واقعات جو براہِ راست مشاہدے پر مبنی ہوں ان کا تناسب کم ہے اور بیشتر لطائف و واقعات دوسروں کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔

شیخ شرف الدین منیری کے ملفوظات میں لطائف کا عنصر کم ہے اور مجموعی طور سے ان کے ملفوظات کا پایۂ اعتبار بلند ہے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ملفوظات میں مختلف الالوان لطائف ملتے ہیں اور مزید براں الحاقی مواد کا بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ سراج الہدایہ کے فاضل مصحح قاضی سجاد حسین صاحب نے تلاش و تجسس کے بعد ثابت کیا ہے کہ سراج الہدایہ میں دوسروں کی تصنیف کے رسالے نقل ہیں اور جو

حدیثیں بیان کی گئی ہیں وہ بیشتر موضوعی ہیں[۲۸] لیکن مخدوم کی دوسری ملفوظ، جامع العلوم زیادہ وقیع اور لطائف سے بھی پُر ہے۔

ملفوظات کی صحت اور درجۂ اعتبار کے بارے میں کچھ ذکر مضمون کے اختتامیہ میں آئے گا۔

حرف انتباہ

کچھ انواع کے لطائف اور قصوں کی طرف سے محقق کو خصوصاً ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ ان میں سے اولاً تو ایسے لطیفے ہیں جنھیں مہتم بالشان الفاظ میں ڈھالا گیا ہے۔ سکالر کو اس کا امکان ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایسے الفاظ برمحل نہیں کہے گئے، بلکہ ان کی تراش خراش میں ایک ہنرمند لطیفہ نگار کا بھی حصّہ ہے۔ یہی معاملہ ایسے لطائف کا ہے جن میں عناصر کا توازن قائم کرکے اور نوک پلک سنوار کے اُنھیں منصّۂ شہود پر جلوہ گر کیا گیا ہے۔ ایسے لطیفوں کی مثالیں ہر دور کے ملفوظات اور تذکروں میں ملتی ہیں۔ اس نوع کی ایک مثال رسالہ قشیریہ میں ملتی ہے جو حسبِ ذیل ہے۔

ایک صوفی کا قول ہے کہ تیس سال میری یہ حالت رہی کہ میری زبان جو کچھ سنتی دل کی طرف سے سنتی، اس کے بعد تیس سال ایسے گزرے کہ دل جو کچھ سنتا زبان کی طرف سے سنتا[۲۹] اس میں جس طرح دو باتوں کو متوازن کیا گیا ہے اس میں آورد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اشخاص میں یہ غیر معمولی مادہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہیں وہ یادگار ہو جائے، پھر بھی محقق کے لیے سلامتی اسی میں ہے کہ ایسے بیانات سے ہوشیار رہے۔

قشیریہ ہی میں ایک عظیم صوفی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "میں بارہ سال تک نفس کا لوہار رہا اور پانچ سال تک اپنے دل کا آئینہ رہا اور ایک سال آئینے میں دیکھتا رہا، میں نے دیکھا کہ میری کمر پہ ظاہری زنار ہے، میں نے بارہ سال اس زنار کو کاٹنے میں لگائے، پھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ زنار میرے باطن میں ہے۔ پانچ سال اس کوشش میں لگے کہ اسے کسی طرح سے کاٹوں۔ پھر تمام معاملہ کشف کے ذریعے سے ظاہر ہوگیا۔ میں نے مخلوق کی طرف دیکھا تو اُنھیں مردہ پایا۔ لہٰذا میں نے مخلوق پہ (جنازے کی) چار تکبیریں کہیں (یعنی انھیں خیرباد کہا)[۳۰]

ان لطائف میں تعلّی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔

یہی کیفیت برجستہ جواب کی یا برجستہ کہے گئے الفاظ کی ہے۔ سیر الاولیا میں شیخ نظام الدین اولیا سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ جب اُنھیں علاء الدین خلجی کا یہ پیام ملا کہ وہ جماعت خانے میں حاضر ہونا چاہتا ہے تو اُنھوں نے فرمایا کہ "میرے گھر کے دو دروازے ہیں، سلطان ایک سے داخل ہوگا تو میں دوسرے سے باہر چلا جاؤں گا"[۳۱]

اس قول کے تیور ایسے تھے کہ اس کا مشہور ہو جانا لازمی تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ امیر خورد کرمانی کی اختراع ہے۔ ہم عصر مورخ ضیاء الدین برنی جو خود شیخ کا مرید تھا اور شیخ کے حلقے کی نمایاں شخصیتوں میں سے تھا، سلطان علاء الدین خلجی کی بدنصیبی کا رونا روتا ہے کہ شہر میں اتنا بڑا بزرگ موجود ہے اور سلطان کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو[۳۲] یہی بیان تاریخی ہے۔ لیکن دو دروازوں والی بات پُرلطف تھی اس لیے اس نے قبولیت پائی، حتیٰ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسے محتاط تذکرہ نگار نے بھی اسے اخبار الاخیار میں شامل کیا ہے[۳۳]

حرفِ آخر

اوپر دی ہوئی بحث میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صوفیانہ لطائف کے ادب کو بغیر تنقیہ، تنقید اور تجزیہ کے استعمال کرنے میں کیسی غلطیوں کا امکان ہے اور ان غلطیوں سے بچنے کے لیے کیا کیا تدابیر کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سب سے مؤثر تدبیر لطائف کی زمرہ بندی اور ذیلی زمرہ بندی ہے۔ زمرہ بندی کے فوائد میں اہم ترین یہ ہے کہ اگلے پچھلے مماثل لطائف کا تقابلی مطالعہ کر کے لطیفے کی قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ اس نے بعد میں کیا کیا شکلیں اختیار کیں، اس طرح لطیفے کا درجۂ اعتبار قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مزید یہ کہ بعض انداز کے لطائف کو پرکھنے میں بڑی ہوشیاری اور استعمال میں احتیاط مزید کی ضرورت ہے۔ ان لطائف میں ایک تو وہ ہیں جو از قسم مثالیہ PARABLE ہیں اور دوسرے وہ جو مہتم بالشان معلوم ہوتے ہیں۔

اختتامیہ

یہ مضمون اصلاً اس رسالے کے اس شمارے میں شائع ہونے کے لیے لکھا گیا تھا جو مرحوم مولانا صباح الدین عبدالرحمن سے منسوب تھا۔ اس مناسبت کے پیش نظر مولانا کی نگارشات پر تبصرہ و تحسین کے چند جملے بے محل نہ ہوں گے۔ یہ اجمالی تبصرہ اس مضمون کے بعض پہلوؤں سے بھی مربوط ہے۔

راقم الحروف کی نظر میں صوفیانہ مطالعے کے سلسلے میں مولانا مرحوم کا سب سے اہم کارنامہ ان کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے بزم صوفیہ کے آخر میں بطور ضمیمے کے دیا ہے اور جس کا عنوان "ملفوظات خواجگان چشت"[۳۴] ہے۔

مرحوم پروفیسر محمد حبیب نے اب سے کوئی اڑتیس سال پہلے ایک بڑے اہم اور تاریخ ساز مضمون[۳۵] میں قدیم چشتی ملفوظات کو جعلی قرار دیا تھا۔ ان میں منجملہ دوسرے ملفوظات کے شیخ عثمان ہرونی، شیخ معین الدین اجمیری، شیخ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ فرید شکر گنج کے ملفوظات جو علی الترتیب ان کے خلفائے اعاظم سے منسوب تھے، شامل ہیں۔ ان کتابوں پر پروفیسر صاحب مرحوم نے یہ اعتراض کیے کہ ان میں بے سر و پا باتیں ہیں، کرامات کی بھرمار ہے اور صاحب ملفوظ سے ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ناقابل تصور ہیں کہ انھوں نے کہی ہوں۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے اپنے مضمون میں اسی قسم کے اعتراضات ان ملفوظات پر وارد کیے ہیں جنھیں عموماً معتبر سمجھا جاتا ہے، خصوصاً فوائد الفواد اور خیر المجالس پر۔ مولانا نے ان کا تنقیہ کر کے بالتفصیل بتایا ہے کہ ان میں بھی اسی قسم کی بے سر و پا اور محیر العقول باتیں ہیں جن کی بنا پر قدیم ملفوظات کو بے اعتبار قرار دیا گیا ہے۔ شیخ نصیر الدین چراغ کے ملفوظات خیر المجالس (مرتبہ حمید قلندر) کے بارے میں مولانا مرحوم نے نشان دہی کی ہے کہ سید محمد گیسو دراز کے بیان کے مطابق جب خیر المجالس کا ایک جزو صاحب ملفوظ کو دکھایا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ "من چیزے دیگر گفتہ ام، مولانا حمید الدین چیزے دیگر سے نبشتہ است"، اور یہ کہہ کر وہ جزو باہر پھینک دیا۔

مولانا نے فوائد الفواد اور خیر المجالس کی جو تنقیہ کی ہے اس سے صرف ایک بات نکل

کر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان مآخذ کو حزم و احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے، اور یہ موقف عالمانہ ہے، معاندانہ نہیں۔ یہ وہ بنیادی بلکہ ابتدائی احتیاط ہے جو تاریخ کے ہر طالب علم کو چاہے وہ کسی درجے کا ہو ہر تاریخی ماخذ کے بارے میں برتنا پڑتی ہے، چاہے وہ کسی نوعیت کا ہو۔ صوفیانہ ادب میں مثالیات، کرامات، شطحیات اور اختراعی مواد کے شامل ہونے کے باعث احتیاطِ مزید کی ضرورت ہے۔

پروفیسر حبیب نے قدیم چشتی ملفوظات کی تنقید کے سلسلے میں ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ "تاریخی زمانے کے بارے میں کوئی کرامات نہیں ہو سکتیں"۔ ان ملفوظاتِ قدیم میں چونکہ ایسے اشخاص کو جن کے زمانوں میں ایک صدی، دو صدی اور تین صدی کا فرق ہے یک جا اور ہم کلام دکھلایا گیا ہے، اس لیے اس اصول کے مطابق یہ ملفوظات لائقِ اعتبار نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جس ملفوظ پر یہ اعتراض حتمی ہے اور کسی غلط فہمی پر مبنی نہیں ہے، وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہو جائے گا۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اس معیار کو مرکزی موضوع بنا کر سارے صوفیانہ ادب کی چھان بین کی جائے۔ کشف المحجوب میں جو تصوف کی معتبر ترین کتابوں میں ہے بایزید (وفات ۲۶۱/۸۷۵ - ۸۷۶) کو ایک پختہ عمر کا انسان دکھایا گیا ہے جنھوں نے شفیق بلخی (وفات ۱۹۴/۸۰۹ - ۸۱۰) کو اس طرح کا مشورہ بلکہ ہدایت بھیجی جیسا کہ بزرگ اپنے سے خام تر لوگوں کو بھیجتے ہیں[۳۶] حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شفیق بلخی کی وفات بایزید کی وفات سے ۱۷ سال پہلے واقع ہوئی تھی۔ خود خیر المجالس میں رابعہ بصری (وفات ۱۸۰ م) اور خواجہ حسن بصری (وفات ۷۲۸ م) کو ہم کلام دکھایا گیا ہے، اگرچہ دونوں کی تاریخ ہائے وفات میں قریب پون صدی کا فرق ہے، اور موضوعِ گفتگو بھی ایسا ہے کہ اس کا یہاں نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے[۳۷] جوامع الکلم اس سے بھی ایک قدم آگے ہے، اس لیے کہ اس میں خواجہ حسن بصری، رابعہ بصری، ابراہیم ادہم (وفات ۷۷۶ یا ۷۹۰) اور ذوالنون مصری (وفات ۸۵۹ م) کو یک جا دکھایا گیا ہے[۳۸] حالانکہ اوّل الذکر اور آخر الذکر کے سال ہائے وفات میں ۱۳۱ سال کا فرق ہے۔ اسی طرح جامع العلوم میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے روایت ہے کہ منصور حلاج (مقتول ۳۰۹/۹۲۲) کے

قتل کا فتویٰ قاضی ابو یوسف (وفات ۱۸۲/۷۹۸) نے دیا تھا۔[۳۹] یہ بات بھی سالوں کے تفاوت کے باعث ناممکن الوقوع ہے۔

یہ مثالیں ایسی ہیں جو اتفاقاً نظر پڑ گئیں۔ تلاش کی جائے تو اس قسم کی غلطیاں کم و بیش ان تمام ملفوظات، تذکروں اور اصولِ تصوف کی کتب میں ملیں گی جو مقابلتاً زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ اور یہی مرحوم مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کے محولہ بالا مقالے کا اصل سبق کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملفوظاتی ماخذ کو مستند نہیں فرض کر لینا چاہیے اور قدیم چشتی ملفوظ کی طرح دیگر ملفوظات کو بھی تنقید کی خوردبین کے نیچے رکھ کر جانچنا ضروری ہے۔

حوالہ جات

۱ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی۔ قصص القرآن۔ ناشر محمد سعید اینڈ سنز۔ کراچی سال ندارد۔ (طبع چہارم)۔ ج-۱۔ ص ۹، ۵۰، ج-۲، ۷۸، ۸۱، ۱۵۶-۱۵۷۔

Also see Fazlur Rahman, Islam, London, 1966 p. 133.

صوفیانہ لطائف اور "اسرائیلیات" کے نقطہ اتصال کی کسی یک اچھی مثال حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریہ کی بیوی کی داستان کا ذکر ہے جو سید محمد گیسو دراز کی ملفوظات جوامع الکلم میں دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو جوامع الکلم مرتبہ سید محمد اکبر حسینی۔ مخطوطہ برٹش میوزیم شمارہ ۲۵۲ OR، ورق ۲۶ الف و ب

۲ ابوالقاسم قشیری۔ رسالہ قشیریہ ترجمہ فارسی۔ باتصحیحات بدیع الزماں فروزانفر تہران۔ ۱۳۴۵ شمسی ۱۹۶۷، ص ۴۰۴-۴۰۵۔ اردو ترجمہ اسلام آباد ۱۹۸۴۔ (مترجم ڈاکٹر بیرجن) قدرے مختلف ہے۔ اس مضمون میں قشیریہ کا اردو ترجمہ دیتے وقت فارسی ترجمے کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور بیشتر اسی پر انحصار کیا گیا ہے۔

۳ ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۳۵۹-۳۶۰

۴ سیر محمدی مولفہ محمد علی سایانی مخطوطہ فارسی نیشنل میوزیم کراچی۔ شمارہ ۱۹۷۰-۲۶۷، این۔ ایم ورق ۲۷ الف و ب۔

۵ جوامع الکلم (ملفوظات سید گیسو دراز) مرتبہ سید محمد اکبر حسینی۔ مخطوطہ فارسی برٹش میوزیم

شمارہ ۲۵۲ - ۵۳ ورق ۲۰۰ الف وب

۶ے ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۳۶۳-۳۶۴

۷ے خواجہ عبداللہ انصاری ہروی، طبقات الصوفیہ۔ تصحیح حبیبی۔ کابل ۱۳۴۱ش۔ ص ۲۷

۸ے غزالی۔ احیاء العلوم (اردو ترجمہ) جلد چہارم مکتبہ رحمانیہ لاہور سال ندارد ص ۳۵۴

۹ے شیخ شہاب الدین سہروردی۔ عوارف المعارف۔ اردو ترجمہ۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۷۔ ص ۴۰۰

۱۰ے
Muhammad Saleem Akhtar (Editor), <u>Kalimat al-Sadiqin</u> of Muhammad Sadiq Dihlawi, Lahore, 1998. Editor's Introduction, PP. 83-85.

۱۱ے شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۳۲/۱۹۱۴، ص ۲۷

۱۲ے الہ دیا چشتی۔ سیر الاقطاب۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ ۱۳۴۱/۱۹۱۳۔ ص ۱۸۹ -

۱۳ے سید صباح الدین عبدالرحمن۔ بزم صوفیہ۔ طبع سوم۔ اعظم گڑھ ۱۹۷۹ء، ص ۲۸۵-۲۸۶

۱۴ے ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۶۷۲

۱۵ے شیخ ابو نصر سراج۔ کتاب اللمع فی التصوف۔ اردو ترجمہ از سید اسرار بخاری۔ اسلامک بک فاؤنڈیشن۔ لاہور ۱۹۸۴ء، ص ۵۲۱

۱۶ے حمید قلندر، خیر المجالس۔ با تصحیح خلیق احمد نظامی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص ۲۵۷

۱۷ے
Simon Digby, 1Qalandars and Related Groups (in the ...Dehli Sultanate of the Thirteenth and Fourteenth Centuries)' in <u>Islam in Asia,</u> the Harry S. Truman Institute for the Advancement of Peace, 1984, Vol. I, P. 81.

۱۸ے خیر المجالس، ص ۲۰۲

۱۹ے
Khaliq Ahmad Nizami, <u>The Life and Times of Shaikh Farid-Uddin Ganj-i-Shakar,</u> Aligarh,

۲۰ے خیر المجالس، ص ۱۸۲۔

۲۱ے خیر المجالس، ص ۲۰۳-۲۰۲

۲۲ے فوائد الفواد، مرتبہ خواجہ حسن دہلوی۔ با تصحیح محمد لطیف ملک۔ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۷۸-۷۹۔

۲۳ے ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۵۶۸ - ۵۶۹۔

۲۴ے فوائد الفواد ص ۲۴۶۔

۲۵ے محمد غوثی شطاری مانڈوی۔ اذکار ابرار، اردو ترجمہ گلزار ابرار۔ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور ۱۳۹۵/۱۹۷۵۔ ص ۱۵۵-۱۵۷۔

۲۶ے ملاحظہ ہو جہانگیر نامہ (توزک جہانگیری) بہ کوشش محمد ہاشم۔ بنیاد فرہنگ ایران ۱۳۵۹ شمسی۔ ص ۹۷۔ یہ واقعہ ۱۲، محرم ۱۰۱۹ ہجری مطابق ۲۷ مارچ ۱۶۱۰ء کو رونما ہوا۔

۲۷ے ابو عبد الرحمن سلمی، ملامتیان و صوفیان و جوانمردان (ترجمہ فارسی) تصحیح دکتور ابو العلا عفیفی۔ کابل ۱۳۴۴ - ص

Also see Fazlur Rahman, Islam, London, 1966, PP.133-134, for the Sufis' invention of 'fanciful' and 'fictitious' hadithes.

۲۸ے سراج الہدایہ (ملفوظات حسین جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت) مرتبہ قاضی سجاد حسین نئی دہلی ۱۹۸۳ء، پیش لفظ، ص ۱۲-۱۳

۲۹ے ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۱۸۷ - ۱۸۸

۳۰ے ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۱۴۷

۳۱ے سید محمد مبارک علوی کرمانی معروف بہ میر خورد۔ سیر الاولیا۔ مؤسسہ انتشارات اسلامی۔ لاہور۔ ص ۱۴۵

۳۲ے ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی۔ بتصحیح سید احمد خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۳۶۶

۳۳ے شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار فی اسرار الابرار۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۲، ۱۹۱۴ء، ص ۵۵۔

۳۴؎ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۔ بزم صوفیہ ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع سوم ۱۹۷۹ء، مضمون محولہ کتاب کے ضمیمے میں صفحات ۶۳۱ ۔ ۶۹۶ پر دیا گیا ہے ۔

۳۵؎
Muhammad Habib, 'Chishti Mystic Records of the Sultanate Period', in Politics and Society during the Early Medieval Period, being the Collected works of Professor Muhammad Habib, Vol. I, Edited by Prof. K.A. Nizami, New Delhi, 1974. The article referred to occurs on PP.385-433. It appeared originally in Medieval India Quarterly, Aligarh Vol. I, No. 2, October 1950.

۳۶؎
'Ali b. 'Uthman al-Hujwiri, Kahsf al-Mahjub, tr. R.A. Nicholson Islamic book Foundation, Lahore, 1976. PP, 358-59.

۳۷؎ خیرالمجالس، ص ۲۰۰ ۔ ۲۰۱ ۔

۳۸؎ جوامع الکلم ۔ نسخہ برٹش میوزیم ۔ ورق ۳۲ الف و ب

۳۹؎ پروفیسر محمد اسلم، "الدر المنظوم کی تاریخی، مذہبی اور سماجی اہمیت ۔ اقبال ریویو جولائی ۱۹۸۴ء، ص ۱۳۴، بحوالہ الدر المنتظوم، ملتان ۱۳۷۷ھ، ص ۱۳۳ ۔

پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام کا شمار پاکستان کے معروف اہلِ علم میں ہوتا ہے ۔ انھوں نے چند سال پہلے برصغیر میں صوفیانہ ادب پر ایک قیمتی مقالہ مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے متعلق " فکر و نظر " کے ایک خاص شمارے کے لیے لکھا تھا ۔ لیکن اس کے بجائے دوسرے شمارے میں شائع ہوا ۔ ڈاکٹر موصوف نے از راہِ کرم یہ مقالہ مجھے کوئٹہ میں عنایت فرمایا تھا ۔ اس مقالے کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر اسے اب "المعارف" میں شائع کیا جارہا ہے ۔

(رشید احمد)